اعتقاد الأوائل

أن الأئمة عليهم السلام معصومون أم مجرد علماء أبرار؟

اسلاف کا عقیدہ

کیا ائمہ علیہم السلام معصوم ہیں یا صرف نیکوکار علماء؟

شیخ یاسر الحبیب

ترتیب: محمد ابو سلطان

مقدمہ

بعض منحرف اور مبالغہ آرائی کرنے والے افراد یہ شبہ پھیلاتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کے اصحاب ان کی عصمت کے قائل نہ تھے، اور اس سلسلے میں وہ ایسی عبارتوں سے استدلال کرتے ہیں جن کے معانی وہ اپنی کم نظری، قلتِ علم اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات، سیرت اور ان سے مروی فرامین میں غوطہ زنی نہ کرنے کی وجہ سے سمجھ نہیں سکے۔ تو کیا یہ سچ ہے کہ پہلے دور کے اصحاب ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے معتقد نہیں تھے؟ اور کیا وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ محض پرہیز گار اور نیکوکار علماء ہیں؟! اس بارے میں حرفِ آخر کیا ہے؟!

اسی سلسلے میں ہمیں "موقع القطرة" (القطرہ ویب سائٹ) کے ذریعے عصمت سے متعلق کچھ سوالات موصول ہوئے، اور ابن الجنید (ابو علی محمد بن احمد بن جنید اسکافی) کے اس عقیدے کے بارے میں بھی سوال کیا گیا جو ان کے حوالے سے شیخ مفید کی "**المسائل السروية**" میں آیا ہے، اور اسی طرح اس واقعے کے بارے میں بھی پوچھا گیا جو معلی بن خنیس اور ابن ابی یعفور کے درمیان پیش آیا تھا، جس کا جواب سماحۃ الشیخ الحبیب نے عنایت فرمایا۔ اس موضوع کی اہمیت اور شبہات کے ازالے کی خاطر ہم نے اسے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ فائدہ عام ہو سکے۔

سوال 1

کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پہلی تین صدیوں کے اکثر اصحاب ائمہ علیہم السلام، ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے معتقد نہیں تھے، اور اس کے باوجود ائمہ علیہم السلام نے انہیں مذہب اور دین سے خارج نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے اس دعوے پر بعض علماء کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں جیسے کہ شہید ثانی اور جو ان کی کتاب "حقائق الایمان" میں وارد ہوا ہے:

"اور یہ بعید نہیں کہ صرف آخری بات (یعنی ائمہ علیہم السلام کی امامت اور ان کی اطاعت کے وجوب کا اجمالی اعتقاد) پر اکتفا کر لیا جائے، جیسا کہ ان کے راویوں اور ان کے ہم عصر شیعوں کے احوال اور ائمہ علیہم السلام سے مروی ان کی احادیث سے ظاہر ہوتا ہے؛ کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگ ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے معتقد نہیں تھے کیونکہ یہ ان پر پوشیدہ تھی، بلکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ائمہ علیہم السلام 'علماء ابرار' (نیکوکار علماء) ہیں۔ یہ بات ان کی سیرت اور ان کی احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتی ہے، اور ابو عمرو کشی رحمہ اللہ کی کتاب میں اس پر مطلع کرنے والی ایک جماعت (کا ذکر) موجود ہے، اس کے باوجود ان لوگوں کے بارے میں ائمہ علیہم السلام کی سیرت سے جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام ان کے ایمان بلکہ ان کی عدالت کا حکم لگاتے تھے"۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے یہاں تک کہتے ہیں: "اور (عصمت کے اعتقاد کو شرط قرار دینے کی صورت میں) لازم آئے گا کہ ان کے اکثر شیعہ ایمان سے خارج ہو جائیں، اور یہ باطل ہے"۔

پس مذکورہ بالا کلام کا معنی کیا ہے؟

جواب نمبر 1: شہید ثانی کے کلام کا معنی ان کے اس کلام سے پہلے والی بحث اور اس چیز کو ملاحظہ کرنے سے واضح ہوتا ہے جس کی طرف انہوں نے حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے:

"أما التصديق بكونهم معصومين مطهرين عن الرجس كما دلت عليه الأدلة العقلية والنقلية والتصديق بكونهم منصوصا عليهم من الله تعالى ورسوله، وأنهم حافظون للشرع، عالمون بما فيه صلاح أهل الشريعة من أمور معاشهم ومعادهم. وأن علمهم ليس عن رأي واجتهاد بل عن يقين تلقوه عن من لا ينطق عن الهوى خلفا عن سلف بأنفس قوية قدسية، أو بعضه لدني من لدن حكيم خبير. وغير ذلك مما يفيد اليقين، كما ورد في الحديث أنهم عليهم السلام محدثون؛ أي: معهم ملك يحدثهم بجميع ما يحتاجون أو يرجع إليهم فيه. أو أنهم يحصل لهم نكت في القلوب بذلك على أحد التفسيرين للحديث. وأنه لا يصح خلو العصر عن إمام منهم وإلا لساخت الأرض بأهلها، وأن الدنيا تتم بتمامهم ولا تصح الزيادة عليهم، وأن خاتمهم المهدي صاحب الزمان عليه السلام وأنه حي إلى أن يأذن الله تعالى له ولغيره، وأدعية الفرقة الناجية المحقة بالفرج بظهوره عليه السلام كثيرة؛ فهل يعتبر في تحقق الإيمان أم يكفي اعتقاد إمامتهم ووجوب طاعتهم في الجملة؟ فيه الوجهان السابقان في النبوة. ويمكن ترجيح الأول، بأن الذي دل على ثبوت إمامتهم دل على جميع ما ذكرناه خصوصا العصمة، لثبوتها بالعقل والنقل وليس بعيدا الاكتفاء بالأخير، على ما يظهر من حال رواتهم ومعاصريهم من شيعتهم في أحاديثهم عليهم السلام، فإن كثيرا منهم ما كانوا يعتقدون عصمتهم لخفائها عليهم، بل كانوا يعتقدون أنهم علماء أبرار، يعرف ذلك من تتبع سيرهم وأحاديثهم، وفي كتاب أبي عمرو الكشي رحمه الله جملة مطلعة على ذلك، مع أن المعلوم من سيرتهم عليهم السلام مع هؤلاء أنهم كانوا حاكمين بإيمانهم بل عدالتهم" (حقائق الإيمان ص ١٥٠)۔

ترجمہ: "جہاں تک اس بات کی تصدیق کا تعلق ہے کہ وہ معصوم اور ناپاکی سے پاک ہیں جیسا کہ عقلی اور نقلی دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں، اور اس بات کی تصدیق کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے منصوص (نامزد) ہیں، اور وہ شریعت کے محافظ ہیں، اہل شریعت کی معاش اور معاد کے امور کی مصلحتوں کو جاننے والے ہیں؛ اور یہ کہ ان کا علم رائے اور اجتہاد سے نہیں بلکہ اس یقین سے ہے جو انہوں نے 'اس ہستی

سے جو اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتی' (رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم) نسل در نسل قوی اور قدسی نفوس کے ذریعے حاصل کیا ہے، یا ان کے علم کا کچھ حصہ 'حکیم وخبیر' کی جانب سے لدنی ہے؛ اور اس کے علاوہ دیگر وہ امور جو یقین کا فائدہ دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ وہ علیہم السلام 'محدث' ہیں یعنی ان کے ساتھ فرشتہ ہوتا ہے جو ان سے ان تمام باتوں کے بارے میں کلام کرتا ہے جن کی انہیں ضرورت ہوتی ہے یا جن میں ان کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، یا یہ کہ حدیث کی دو تفسیروں میں سے ایک کے مطابق ان کے دلوں میں (حقائق) القاء کیے جاتے ہیں؛ اور یہ کہ کوئی بھی زمانہ ان میں سے کسی امام کے وجود سے خالی ہونا درست نہیں ورنہ زمین اپنے رہنے والوں سمیت دھنس جائے گی، اور یہ کہ دنیا ان کے مکمل ہونے سے مکمل ہو گی اور ان کی تعداد پر اضافے کی گنجائش نہیں، اور یہ کہ ان کے خاتم مہدی صاحب الزمان علیہ السلام ہیں اور وہ زندہ ہیں جب تک اللہ تعالیٰ انہیں اور دوسروں کو (ظہور کی) اجازت نہ دے دے، اور فرقہ حقہ ناجیہ کی ان کے ظہور کے ذریعے فرج (کشادگی) کی دعائیں کثیر ہیں؛ تو کیا (ان سب باتوں کی تصدیق) ایمان کے تحقق میں معتبر ہے یا صرف اجمالی طور پر ان کی امامت اور ان کی اطاعت کے وجوب کا اعتقاد کافی ہے؟ اس میں وہی دو پہلو ہیں جو نبوت (کی بحث) میں گزرے ہیں۔ اور پہلے پہلو کو ترجیح دینا ممکن ہے، کیونکہ جس دلیل نے ان کی امامت کے ثبوت پر دلالت کی ہے اسی نے ان تمام باتوں پر بھی دلالت کی ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے خصوصاً عصمت، کیونکہ یہ عقل اور نقل سے ثابت ہے؛ اور یہ بعید نہیں کہ صرف آخری بات (اجمالی اعتقاد) پر اکتفا کر لیا جائے، جیسا کہ ان کے راویوں اور ان کے ہم عصر شیعوں کے احوال اور ائمہ علیہم السلام سے مروی ان کی احادیث سے ظاہر ہوتا ہے؛ کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگ ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے معتقد نہیں تھے کیونکہ یہ ان پر پوشیدہ تھی، بلکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ائمہ علیہم السلام 'علماء ابرار' ہیں، یہ بات ان کی سیرت اور ان کی احادیث کے تتبع سے

معلوم ہوتی ہے، اور ابو عمرو کشی رحمہ اللہ کی کتاب میں اس پر مطلع کرنے والی ایک جماعت (کا ذکر) موجود ہے، اس کے باوجود ان لوگوں کے بارے میں ائمہ علیہم السلام کی سیرت سے جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام ان کے ایمان بلکہ ان کی عدالت کا حکم لگاتے تھے"۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ اس بارے میں بحث ہے کہ تحققِ ایمان کے لیے ضروری (ضروریاتِ ایمان) کیا ہے، اور اس میں عصمت کا اعتقاد بھی شامل ہے، جہاں انہوں نے اس کے ضروری ہونے کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس پر دلالت کرنے والی دلیل وہی ہے جو امامت پر دلالت کرتی ہے۔ پھر اس ترجیح کے باوجود؛ انہوں نے عصمت کا اعتقاد نہ رکھنے والے سے صفتِ ایمان سلب نہ کرنے کو بعید قرار نہیں دیا، کیونکہ انہوں نے اپنے بہت سے اصحاب پر ائمہ علیہم السلام کے ایمان بلکہ عدالت کے حکم کو ظاہر پایا ہے باوجود اس کے کہ ان کی خبریں عصمت پر ان کے عدمِ ایمان کو ظاہر کرتی ہیں جیسا کہ رجال کشی میں ہے۔

لیکن شہید ثانی کی اس کلام سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ جو عصمت کے بغیر امامت پر ایمان رکھتا ہے وہ مطلقاً مومن ہے؛ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جو امامت پر ایمان رکھتا ہے اور عصمت (کی حقیقت) اس پر پوشیدہ رہ جاتی ہے، تو اس کے ایمان کا تحقق بعید نہیں، کیونکہ وہ حقیقت میں 'قاصر' (جس تک بات نہ پہنچی ہو) ہے 'مقصر' (کوتاہی کرنے والا) نہیں۔

شہید ثانی کا یہ قول آپ کی اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ یہی ان کی مراد ہے:

"کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگ ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے معتقد نہیں تھے کیونکہ یہ ان پر پوشیدہ تھی"

، یعنی وہ اس سے مطلع نہیں ہو سکے تھے یا امامت کی ایک تفصیل ہونے کے ناطے اسے درک نہیں کر سکے تھے، ایسا نہیں تھا کہ عصمت ان پر ظاہر تھی اور وہ اس سے مطلع تھے اور پھر بھی انہوں نے اس کا انکار کیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً ایمان سے خارج ہوتے۔

رہی بات اس پوشیدگی (خفاء) کی وجہ کی، تو وہ اس میں مضمر ہے کہ ائمہ علیہم السلام کے بہت سے اصحاب وہ لوگ تھے جنہوں نے ہدایت پائی تھی اور وہ تشیع اختیار کرنے والے تھے، یعنی وہ مخالف مذہبی ماحول سے آئے تھے۔

اور یہ معلوم ہے کہ اس ماحول میں عصمت کا عقیدہ بالکل متروک تھا، حتیٰ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے بھی قائل نہ تھے؛ چہ جائیکہ ان سے کم تر ہستیوں کی عصمت کا عقیدہ رکھتے، کیونکہ وہ اسے غلو کی ایک قسم سمجھتے تھے۔ کسی انسان کا اپنے سابقہ باطل عقیدے کے تمام اثرات سے پاک ہونا ایک ایسا معاملہ ہے جو وقت، محنت اور دلائل کی کثرت و وضاحت کا متقاضی ہوتا ہے، اور یہ چیز بہت سے اصحاب کے لیے ان کی عمر کے حصوں میں میسر نہ آ سکی، خاص طور پر تقیہ اور ظلم و ستم کے ان حالات میں جن میں خود ائمہ علیہم السلام کو اپنے بہت سے خصائص اور حقائق کو اپنے مخلص ترین اصحاب سے بھی چھپانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا تاکہ ان پر شفقت کی جائے اور انہیں خطرے سے بچایا جائے، کیونکہ اگر کوئی شخص یہ صراحت کر دیتا کہ مثال کے طور پر وہ امام کاظم علیہ السلام کی عصمت کا عقیدہ رکھتا ہے، تو یہ چیز حکومت، اس کے فقہاء اور قاضیوں کے نزدیک اس پر غلو اور کفر کا حکم لگانے کا موجب بن جاتی، اور ہو سکتا تھا کہ یہ اسے اس کی جان کی قیمت پر پڑتا۔

اور ائمہ علیہم السلام کے اصحاب بعض اوقات یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ علیہم السلام ان سے کچھ باتیں چھپا رہے ہیں یا عوارض اور ناموافق حالات انہیں پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں، اسی لیے وہ اللہ کے سامنے اور لوگوں کے سامنے بار بار یہ دہراتے تھے کہ تمام اشیاء میں ان کا قول وہی ہے جو آلِ محمد علیہم السلام کا قول ہے، ان باتوں میں بھی جو انہوں

نے پوشیدہ رکھیں اور جن کا انہوں نے اعلان کیا، اور ان باتوں میں بھی جو ان تک پہنچیں اور جو ان تک نہیں پہنچیں۔ حقیقت میں اس زمانے کے حالات میں ایمان کی تکمیل کے لیے یہ کافی تھا اگرچہ ان میں سے کوئی مومن عصمت کی تفصیل سے واقف نہ بھی ہو پاتا، کیونکہ یہ ایک ایسی تفصیل ہے جسے اس نے اپنے (اجمالی) عقیدے میں شامل کر رکھا تھا۔

اور شہید ثانی نے اپنی مذکورہ کلام سے یہی مراد لیا ہے، چنانچہ انہوں نے اصلِ امامت پر اعتقاد کی تفصیلات کے ذکر کے بعد فرمایا:

"تو کیا ایمان کے متحقق ہونے میں [اس تفصیل] کا اعتبار کیا جائے گا یا ان کی امامت اور ان کی اطاعت کے وجوب کا اجمالی اعتقاد کافی ہے؟ اس میں وہی دو وجوہات ہیں جو نبوت میں گزر چکی ہیں۔"

پس آپ دیکھ رہے ہیں کہ انہوں نے یہاں اس بات کی طرف حوالہ دیا ہے جو انہوں نے پہلے اصلِ نبوت کے بارے میں ذکر کی تھی، اور وہ دو صفحات پہلے ہے جہاں انہوں نے کہا:

«الأصل الثالث التصديق بنبوة محمد صلى الله عليه وآله وبجميع ما جاء به تفصيلا في ما علم تفصيلا، وإجمالا في ما علم إجمالا. وليس بعيدا أن يكون التصديق الإجمالي بجميع ما جاء به عليه السلام كافيا في تحقق الإيمان، وإن كان المكلف قادرا على العلم بذلك تفصيلا يجب العلم بتفاصيل ما جاء به من الشرائع للعمل به. وأما تفصيل ما أخبر به من أحوال المبدأ والمعاد، كالتكليف بالعبادات، والسؤال في القبر وعذابه، والمعاد الجسماني، والحساب والصراط، والجنة والنار، والميزان وتطاير الكتب، مما ثبت مجيئه به تواترا، فهل التصديق بتفاصيله معتبرة في تحقق الإيمان؟ صرح باعتباره جمع من العلماء. والظاهر أن التصديق به إجمالا كاف، بمعنى إن المكلف لو اعتقد حقية كل ما أخبر به عليه السلام، بحيث كلما ثبت عنده جزئي منها صدق به تفصيلا، كان مؤمنا، وإن لم يطلع على تفاصيل تلك الجزئيات بعد. ويؤيد ذلك أن أكثر الناس في الصدر الأول لم يكونوا عالمين

بهذه التفاصيل في الأول، بل كانوا يطلعون عليها وقتا فوقتا، مع الحكم بإيمانهم في كل وقت من حين التصديق بالوحدانية والرسالة، بل هذا حال أكثر الناس في جميع الأعصار كما هو المشاهد فلو اعتبرناه لـزم خروج أكثر أهل الإيمان عنه، وهو بعيد عن حكمة العزيز الحكيم (حقائق الإيمان ص ١٤٨).»

(تیسری اصل محمد ﷺ کی نبوت کی تصدیق کرنا ہے اور ان تمام چیزوں کی تصدیق کرنا ہے جو آپ لے کر آئے، ان چیزوں میں تفصیلی جن کا علم تفصیلی ہے اور ان میں اجمالی جن کا علم اجمالی ہے۔ اور یہ بعید نہیں کہ آپ ﷺ جو کچھ لائے اس کی اجمالی تصدیق ایمان کے متحقق ہونے کے لیے کافی ہو، اگرچہ مکلف اس کے تفصیلی علم پر قادر ہو، تاہم شرائع کی تفصیلات کا علم ان پر عمل کرنے کے لیے واجب ہے۔ رہے وہ امور جن کی آپ ﷺ نے خبر دی جیسے مبدأ اور معاد کے احوال، عبادات کی تکلیف، قبر میں سوال اور اس کا عذاب، معادِ جسمانی، حساب، صراط، جنت، دوزخ، میزان اور نامہ اعمال کا اڑنا، ان میں سے وہ چیزیں جن کا آپ ﷺ کی طرف سے لایا جانا تواتر سے ثابت ہے، تو کیا ان کی تفصیلات کی تصدیق ایمان کے تحقق میں معتبر ہے؟ علماء کی ایک جماعت نے اس کے معتبر ہونے کی تصریح کی ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان کی اجمالی تصدیق کافی ہے، اس معنی میں کہ اگر مکلف آپ ﷺ کی دی ہوئی ہر خبر کی حقانیت کا اعتقاد رکھے، اس طرح کہ جب بھی اس کے پاس ان میں سے کوئی جزئی چیز ثابت ہو جائے تو وہ اس کی تفصیلی تصدیق کرے، تو وہ مومن ہو گا؛ اگرچہ ابھی تک ان جزئیات کی تفصیلات سے مطلع نہ ہوا ہو۔ اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ صدرِ اول میں اکثر لوگ ابتدا میں ان تفصیلات سے عالم نہیں تھے، بلکہ وہ وقت فوقت ان پر مطلع ہوتے تھے، جبکہ توحید اور رسالت کی تصدیق کے لمحے سے ہی ہر وقت ان کے ایمان کا حکم لگایا جاتا رہا ہے، بلکہ یہی حال تمام زمانوں میں

اکثر لوگوں کا ہے جیسا کہ مشاہدہ کیا جاتا ہے، پس اگر ہم اس (تفصیلی علم) کا اعتبار کریں تو اکثر اہل ایمان کا اس سے خارج ہونا لازم آئے گا، اور یہ اللہ عزیز و حکیم کی حکمت سے بعید ہے (حقائق الایمان ص 148))۔

پس؛ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ایمان ائمہ علیہم السلام کے اصحاب میں سے معتبر مانا گیا ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اصحاب کی طرح ہیں جن سے تفصیلات اور جزئیات پوشیدہ رہیں اور وہ وقت فوقت ان پر مطلع ہوتے رہے، ان کی طرف سے یہ نہ تو انکار تھا اور نہ کوتاہی بلکہ یہ قصور (کم علمی) یا عوارض، موانع اور حالات کی وجہ سے تھا، تو ایسی صورت میں ایمان کے تحقق میں ان کی اجمالی تصدیق کافی ہے بشر طیکہ یہ بات محقق ہو کہ ان میں سے کوئی بھی شخص جب بھی کسی جزئی چیز کے ثابت ہونے کو پاتا تھا تو اس کی تفصیلی تصدیق کرتا تھا۔

یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہے کہ وہ شخص جو اس بات کا قائل ہے کہ ائمہ علیہم السلام کے بہت سے اصحاب سے عصمت پوشیدہ رہی، وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن سے یہ پوشیدہ نہیں رہی کیونکہ ان کے حالات نے انہیں اس پر مطلع ہونے کی اجازت دی، چنانچہ وہ اس پر ایمان لائے، اس کی خبریں بیان کیں اور اسے اہل حق کے درمیان ایک راسخ عقیدے کے طور پر پھیلایا۔ پھر یہ کہ جن لوگوں سے عصمت پوشیدہ رہی، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بعد میں وہ ان پر ظاہر ہو جاتی تو وہ اس پر ایمان لے آتے اور اس کا پختہ یقین کر لیتے۔ اور یہاں اس کا تصور سدیر صیرفی کی مثال سے کیا جا سکتا ہے، ہم نے ایک روایت میں انہیں پایا کہ وہ امام صادق علیہ السلام پر اعتراض کر رہے ہیں یا انہیں ملامت کر رہے ہیں جس سے ان کے عصمتِ امام علیہ السلام کے ادراک نہ کرنے کا انکشاف ہوتا ہے، جب انہوں نے امام علیہ السلام سے کہا:

"خدا کی قسم! آپ علیہ السلام کے لیے بیٹھنا (خاموش رہنا) جائز نہیں"

تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "کیوں اے سدیر؟"

انہوں نے کہا: "آپ علیہ السلام کے چاہنے والوں، شیعوں اور انصار کی کثرت کی وجہ سے، خدا کی قسم اگر امیر المومنین علیہ السلام کے پاس آپ علیہ السلام کے جتنے شیعہ، انصار اور موالی ہوتے تو تیم اور عدی (قبیلے) آپ علیہ السلام پر طمع نہ کرسکتے" (الکافی ج2ص424)۔

پھر تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ سدیر نے کچھ وقت بعد عصمت کا ادراک کر لیا جب انہوں نے امام علیہ السلام سے ان کا یہ صریح قول سنا:

«نحن قوم معصومون، أمر الله تبارك وتعالى بطاعتنا ونهى عن معصيتنا، نحن الحجة البالغه على من دون السماء وفوق الأرض» **(الكافیج 1 ص 269)**

(ہم علیہم السلام وہ قوم ہیں جو معصوم ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری اطاعت کا حکم دیا ہے اور ہماری نافرمانی سے منع کیا ہے، ہم آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر (موجود مخلوق پر) اللہ کی حجتِ بالغہ ہیں)۔

اور یہ آخری روایت بظاہر پہلی روایت سے زمانے کے اعتبار سے متاخر (بعد کی) ہے، اس قرینے کی بنیاد پر کہ سدیر سے روایت کرنے والا راوی ابو طالب ازدی شعرانی ہے اور ان سے ابو عبد اللہ برقی۔

سوال2

سید بحر العلوم کی جانب سے ابن الجنید کا دفاع کرنے کی کیا تفسیر ہے، جبکہ ابن الجنید کا کہنا تھا کہ عصمت کا عقیدہ نہ رکھنا مذہب سے خارج نہیں کرتا؟

جواب ۲: جہاں تک ابن الجنید کا تعلق ہے، تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ عصمت کا عقیدہ نہ رکھنا مذہب سے خارج نہیں کرتا، اور نہ ہی ہمیں ان سے اس بارے میں کوئی نص (تحریر) ملی ہے۔ ہمیں تو صرف وہ بات پہنچی ہے جو شیخ مفید کی **"المسائل السروية"** میں آئی ہے کہ ابن الجنید نے اپنے ایک رسالے میں، جس کا نام **"المسائل المصرية"** ہے، اخبار (احادیث) کے تعارض کو ائمہ علیہم السلام کے رائے کے ساتھ فتویٰ دینے پر محمول

کیا ہے، اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ معصوم نہیں ہیں بلکہ اہل نظر اور اہل اجتہاد میں سے ہیں۔ چونکہ **"المسائل المصرية"** کا ابن الجنید کے رسائل میں سے ہونا معلوم نہیں ہے کیونکہ اسے ذکر کرنے میں **"المسائل السروية"** منفرد ہے، بلکہ سرے سے **"المسائل السروية"** کا شیخ مفید کی تصنیف ہونا ہی ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا ابن الجنید کے اس قول کے قائل ہونے پر قطعیت کا اظہار کرنا تقویٰ اور احتیاط کے منافی ہے، پس شاید وہ شخص اس سے بری ہو، یا یہ کہ اسے غلط سمجھا گیا ہو، بہر حال ان سے یہ قول مشہور نہیں ہے، اور نہ ہی ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر ایک ایسی کتاب میں جس کی نسبت خود اس کے منسوب کرنے والے کی طرف ہی معلوم نہیں ہے، اور اگر وہ اس کے قائل ہوتے تو یہ ان سے اسی طرح مشہور ہوتا جیسے ان کا قولِ قیاس مشہور ہوا، اور اسے ان کی تصانیف کو رد کرنے اور ان پر اعتماد نہ کرنے کی سب سے بڑی علت قرار دیا جاتا، جبکہ حال یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کی کتابوں کے رد کی علت صرف ان کا قیاس کا قائل ہونا ہی ہے، جیسا کہ ہم مثال کے طور پر شیخ الطائفہ (شیخ طوسی) کے ہاں ان کے حالات زندگی میں پاتے ہیں کہ انہوں نے ان کے بارے میں فرمایا:

«جيد التصنيف حَسَنَه، إلا أنه كان يرى القول بالقياس فتركت لذلك كتبه ولم يعول عليها»

(الفہرست ص۲۰۹.)

> "وہ عمدہ اور اچھی تصانیف کے مالک ہیں، سوائے اس کے کہ وہ قیاس کے قائل تھے، اسی لیے ان کی کتابوں کو چھوڑ دیا گیا اور ان پر اعتماد نہیں کیا گیا"۔

پس یہی بات یعنی ائمہ علیہم السلام کی عدمِ عصمت کے بارے میں ان کے قول کا مشہور نہ ہونا ہی سید بحر العلوم کی جانب سے ان کے دفاع کا راز ہے، چنانچہ انہوں نے فرمایا:

«وهذا القول وإن لم يشتهر عنه إلا أن قوله بالقياس معروف مشهور» (الفوائد الرجالية ج ٣ ص ٢١٣).

"اور یہ قول (عدمِ عصمت) اگرچہ ان سے مشہور نہیں ہے لیکن ان کا قیاس کا قول معروف و مشہور ہے"۔

مزید بر آں سید نے وہ بات بھی طے کی ہے جو شہید ثانی کے کلام کے ہم پلہ ہے کہ ایسے مقامات پر ادلہ کے مخفی ہونے پر محمول کیا جائے گا، چنانچہ انہوں نے فرمایا:

«والوجه في الجمع بين ذلك وبين ما نراه من اتفاق الأصحاب على جلالته وموالاته وعدم قطع العصمة بينهم وبينه، حمله على الشبهة المحتملة في ذلك الوقت لعدم بلوغ الأمر فيه إلى حد الضرورة، فإن المسائل قد تختلف وضوحا وخفاء باختلاف الأزمنة والأوقات، فكم من أمر جلي ظاهر عند القدماء قد اعتراه الخفاء في زماننا لبعد العهد وضياع الأدلة. وكم من شيء خفي في ذلك الزمان قد اكتسى ثوب الوضوح والجلاء باجتماع الأدلة المنتشرة في الصدر الأول، أو تجدد الإجماع عليه في الزمان المتأخر» (المصدر نفسه ج ٣ ص ٢١٥ .)

"اس بات اور اصحاب کے ان کی جلالت و دوستی پر اتفاق اور ان کے درمیان پیوندِ عصمت کے نہ ٹوٹنے کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ اسے اس وقت کی ایک ممکنہ شبہ پر محمول کیا جائے کیونکہ اس وقت یہ معاملہ حدِ ضرورت تک نہیں پہنچا تھا، اس لیے کہ مسائل زمانوں اور اوقات کے بدلنے سے واضح یا مخفی ہونے کے اعتبار سے بدل جاتے ہیں، پس کتنے ہی ایسے امور ہیں جو قدماء کے نزدیک بالکل واضح اور ظاہر تھے مگر ہمارے زمانے میں طویل عرصہ بیت جانے اور دلائل کے ضائع ہونے کی وجہ سے ان میں خفاء آ گیا ہے، اور کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو اس زمانے میں مخفی تھیں مگر صدرِ اول میں بکھرے ہوئے دلائل کے جمع ہو جانے یا متاخر زمانے میں اس پر اجماع کے تازہ ہو جانے کی وجہ سے وہ اب وضاحت اور روشنی کا لباس پہن چکی ہیں"۔

اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دفاع اس وجہ سے مخدوش ہے کہ شیخ مفید کی کتاب "المسائل السروية" کا ثبوت موجود ہے، پس اس کی زبان وہی شیخ مفید کی زبان ہے جو ان سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ شیخ مفید کا ایک اور رسالہ بھی ہے جسے نجاشی نے "النقض على ابن الجنيد في اجتهاد الرأي" کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور ایک دوسرا رسالہ "رسالة الجنيدي إلى أهل مصر" کے عنوان سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ابن جنید پر رد کی نسبت شیخ مفید کی طرف درست ہے۔ رہا معاملہ ابن جنید کی طرف اس قول کی نسبت کا، تو اس کا مشہور نہ ہونا اس پر جزم کرنے میں مانع ہے، لہذا اب صرف یہی احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ شیخ مفید کو ابن جنید کی مراد سمجھنے میں غلطی لگی ہو یا انہوں نے یہ لازمہ ان پر تھوپ دیا ہو اور وہ یہ کہ ائمہ علیہم السلام رائے کے قائل ہیں، کیونکہ بہر حال ابن جنید سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس میں اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ہے، اور تقویٰ و احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے صریح قول پر مطلع ہونے اور اس کے ان سے مشہور ہونے سے پہلے اس نسبت کو ان کی طرف دینے سے روکا جائے۔ بعض علماء نے ابن جنید پر رد کرنے والوں کا اس بات سے استدراک کیا ہے جو ان کی مراد سمجھنے میں غلطی کا فائدہ دیتی ہے، پس مثال کے طور پر ملاحظہ کریں "عوالي اللئالي" پر آقا مجتبیٰ عراقی کے حاشیے میں کیا ہے:

"قال السيد المرتضى رحمه الله : قد روت الشيعة الإمامية كلها ما هو موجود في كتبها ومشهور في رواياتها –

سید مرتضیٰ رحمہ اللہ نے فرمایا: تمام شیعہ امامیہ نے وہ روایت کیا ہے جو ان کی کتب میں موجود اور ان کی روایات میں مشہور ہے – پھر انہوں نے یہ مشہور حدیث نقل کی اور اسی طرز کی دیگر احادیث سے اس کی تائید کی–

ثم قـال بعدها : فالذي يروي هذه الأخبار مستحسنا لها ومعولا عليها كيف يجوز منه الشك في أنه كان يذهب إلى أن الحاكم يحكم بعلمه لولا قلة التأمل من ابن الجنيد؟–

پھر اس کے بعد فرمایا: پس جو شخص ان اخبار کو پسند کرتے ہوئے اور ان پر اعتماد کرتے ہوئے روایت کرتا ہے، اس کے بارے میں یہ شک کرنا کیسے جائز ہے کہ وہ اس طرف جاتا تھا کہ حاکم اپنے علم کے مطابق حکم دیتا ہے، اگر ابن جنید کے غور و فکر کی کمی نہ ہوتی؟

–قال الشيخ أبو العباس : هذا الرد من السيد والحط على ابن الجنيد بالمعارضة له بحكم علي عليه السلام وهو إمام معصوم يدل على أن المانع يمنع منه أيضا، فكيف يُدعى اتفاق الإمامية كافة على أن الحاكم يحكم بعلمه وموضع الخلاف غيره ؟ لكنه أعلم بما قال. والذي يظهر لي من هذه العبارة أن احتجاج السيد المرتضى على ابن الجنيد بهذا الحديث وما شاكله ليس مطابقا لموضع الخلاف، لأن موضع الخلاف في أنه هل للحاكم أن يحكم بعلمه على الإطلاق ؟ والسيد احتج على أن عليا عليه السلام حكم بعلمه، وذلك ليس محل الخلاف، فلعل المخالف إنما خالف في غير المعصوم ولم يخالف في المعصوم. هكذا توجيه كلام الشيخ أبو العباس، وهو حسن فإن الظاهر أن الخلاف بينهم إنما هو في غير الإمام –

شیخ ابو العباس نے کہا: سید مرتضیٰ کا یہ رد اور ابن جنید کی تنقیص ان کے مقابلے میں حضرت علی علیہ السلام کے حکم کو پیش کر کے، جو کہ امام معصوم ہیں، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روکنے والا اس سے بھی روکتا ہے، تو پھر تمام امامیہ کے اس بات پر اتفاق کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ حاکم اپنے علم کے مطابق حکم دیتا ہے حالانکہ جائے اختلاف اس کے علاوہ ہے؟ لیکن وہ اپنی بات کو بہتر جانتے ہیں۔ اور اس عبارت سے مجھے جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سید مرتضیٰ کا ابن جنید کے خلاف اس حدیث اور اس جیسی دیگر روایات سے احتجاج محلِ خلاف کے

مطابق نہیں ہے، کیونکہ محلِ خلاف یہ ہے کہ کیا حاکم کے لیے جائز ہے کہ وہ علی الاطلاق اپنے علم پر حکم دے؟ جبکہ سید نے اس بات سے احتجاج کیا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے علم سے حکم دیا، اور یہ محلِ خلاف نہیں ہے، پس شاید مخالف نے صرف غیر معصوم میں مخالفت کی ہو اور معصوم میں مخالفت نہ کی ہو۔ شیخ ابو العباس کے کلام کی توجیہ یہی ہے، اور یہ اچھی توجیہ ہے کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ ان کے درمیان اختلاف صرف غیر امام کے بارے میں ہے"۔(عوالي اللئالي ج٣ص٥١٩)۔

جہاں تک ابن جنید پر عصمت کے دلائل کے مخفی رہ جانے کے امکان کا تعلق ہے تو یہ دعویٰ بھی اسی طرح کمزور ہے، کیونکہ ان کے زمانے میں - جب وہ کلینی کے ہم عصر تھے - اصول میں دلائل مستحکم ہو چکے تھے۔ پس قابلِ اعتماد بات یہی ہے کہ اسے ان کی مراد سمجھنے میں غلطی پر محمول کیا جائے، ورنہ عصمت کے معاملے میں ان پر نکیر اور اعتراض کرنے میں شیخ مفید کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے۔

اور ہم - بہر حال - شریعت کے قواعد اور اس کے احکام کی پابندی کے سوا کوئی چارہ نہیں رکھتے، پس جب ہم اپنے کسی بندے کو اس کی عدالت کے ذریعے پہچان لیں، پھر ہمارے پاس اس کے بارے میں کوئی ایسی حکایت آئے جو اس عدالت کو مخدوش کرتی ہو، اور ہمیں وہ حکایت ثابت شدہ نہ ملے یا وہ قطع و اطمینان کا فائدہ نہ دے رہی ہو؛ تو ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ محض اس رد کی وجہ سے اس کی عدالت کو ساقط کر دیں یا اسے خود سے نکال باہر کریں۔ ابن جنید کا حال بھی یہی ہے؛ اور یہ بالکل احمد بن نوح سیرافی کے حال کی طرح ہے؛ جو فقاہت اور وثاقت کے ساتھ معروف تھے، لیکن ان کے بارے میں حکایت کی گئی کہ وہ ایک فاسد عقیدے یعنی اللہ تعالیٰ کی رویت کے امکان کے قائل تھے، تو ماہرینِ رجال کے پاس ان کی عدالت اور وثاقت کی بقا کا حکم لگانے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا، کیونکہ وہ حکایت ان سے ثابت نہیں ہو سکی تھی۔

سوال 3

"علماء ابرار یا اتقیاء" والی اس روایت کی آپ کی کیا تفسیر ہے جو معلی بن خنیس اور ابن ابی یعفور کے درمیان پیش آئی؟

جواب: عبد اللہ بن ابی یعفور اور معلی بن خنیس کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ پہلے (ابن ابی یعفور) کے ائمہ علیہم السلام کی عصمت کے عقیدے کی نفی پر دلالت نہیں کرتی، اور نہ ہی اس روایت میں امام صادق علیہ السلام کا کلام اس نفی کی تصحیح پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ وہاں جو کچھ ہوا اس کی انتہا صرف یہ تھی کہ امام علیہ السلام نے اس وہم کو دور فرمایا جو ابن خنیس کو لاحق ہو گیا تھا کہ ائمہ علیہم السلام پر نبوت کی صفت کا اطلاق ممکن ہے، اس بہانے سے کہ ان کا محدث ہونا (فرشتوں سے کلام کرنا) ثابت ہے جیسے کہ انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں۔ اور یہ رہا بیان:

کشی نے اپنی سند سے ابو العباس البقباق سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں:

«تذاكر ابن أبي يعفور و معلى بن خنيس، فقال ابن أبي يعفور : الأوصياء علماء أبرار أتقياء. وقال ابن خنيس : الأوصياء أنبياء. قال: فدخلا على أبي عبد الله عليه السلام قال : فلما استقر مجلسهما، قال: فبدأهما أبو عبد الله عليه السلام فقال: يا عبد الله ابرأ ممن قال إنا أنبياء» (رجال الکشی ص۲۲۱)

"ابن ابی یعفور اور معلی بن خنیس نے ایک دوسرے سے مذاکرہ کیا، تو ابن ابی یعفور نے کہا: اوصیاء (ائمہ) نیکوکار اور پرہیز گار علماء ہیں۔ اور ابن خنیس نے کہا: اوصیاء انبیاء ہیں۔ راوی کہتا ہے: پھر وہ دونوں ابو عبد اللہ (امام صادق) علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ جب وہ مجلس میں بیٹھ گئے تو ابو عبد اللہ علیہ السلام نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا: اے عبد اللہ! اس شخص سے بیزاری کا اظہار کرو جو یہ کہتا ہے کہ ہم نبی ہیں۔"

یہ روایت — جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں — اس میں صرف ان لوگوں سے براءت کا ذکر ہے جو ان علیہم السلام کے بارے میں انبیاء ہونے کا قول کرتے ہیں، لیکن بعض ٹیڑھی طبیعت رکھنے والوں کو یہ پسند آتا ہے کہ وہ اسے

ایک دوسرے معنی کی طرف لے جائیں اور وہ ہے ائمہ علیہم السلام کی عصمت کی نفی۔ اور اگر آپ ان سے دلیل مانگیں تو وہ کہتے ہیں: یہاں امام کی براءت دراصل معلی بن خنیس کے عقیدے سے ہے، اور اس طرح امام عبد اللہ بن ابی یعفور کے عقیدے کی تصدیق کر رہے ہیں، کیونکہ جھگڑا دونوں فریقوں کے درمیان تھا اور وہ امام علیہ السلام کے پاس فیصلہ کروانے آئے تھے، اور ابن ابی یعفور کا ان کے بارے میں عقیدہ صرف یہ تھا کہ وہ محض نیکوکار اور پرہیزگار علماء ہیں، انہوں نے یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ معصوم ہیں یا ان کی کوئی غیر معمولی خصوصیات ہیں، اور نہ ہی امام علیہ السلام نے اس کا ذکر کیا۔

اور یہ ایک مضحکہ خیز استدلال ہے! کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس قول کے درمیان کوئی تضاد نہیں کہ اوصیاء نیکوکار پرہیزگار علماء ہیں اور اس قول کے درمیان کہ وہ معصوم ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ثقۃ الاسلام کلینی علیہ الرحمہ ہیں؛ وہ ان کے بارے میں "علماء" کی تعبیر استعمال کرتے تھے جبکہ اس کے باوجود وہ ان کی عصمت کے معتقد تھے، چنانچہ آپ انہیں اپنی کتاب الکافی کے دیباچے میں یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں:

« فاعلم يا أخي أرشدك الله أنه لا يسع أحدا تمييز شيء مما اختلف الرواية فيه عن العلماء عليهم السلام برأيه، إلا على ما أطلقه العالم بقوله عليه السلام: اعرضوها على كتاب الله فما وافى كتاب الله عز وجل فخذوه، وما خالف كتاب الله فردوه » (الکافی ج ۱ ص ۸)

"پس اے میرے بھائی، اللہ تمہاری رہنمائی فرمائے، جان لو کہ کسی کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اپنی رائے سے ان روایات میں تمیز کرے جن میں علماء (ائمہ) علیہم السلام سے مروی احادیث میں اختلاف ہو گیا ہے؛ سوائے اس طریقے کے جو عالم (امام) علیہ السلام نے اپنے اس قول کے ذریعے بیان فرما دیا ہے کہ: ان (روایات) کو اللہ کی

کتاب پر پیش کرو، پس جو اللہ عزوجل کی کتاب کے موافق ہو اسے لے لو، اور جو کتاب اللہ کے مخالف ہو اسے رد کر دو۔"

پھر آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی کتاب کے ابواب میں سے ایک باب کا عنوان یہ قائم کرتے ہیں:

"باب اس بیان میں کہ ائمہ گزشتہ لوگوں میں سے کن کے مشابہ ہیں؛ اور ان کے بارے میں نبوت کا قول کرنے کی کراہت"

،اور اس میں پہلی حدیث وہ رکھتے ہیں جو حمران بن اعین سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں:

« قلت لأبي جعفر عليه السلام: ما موضع العلماء ؟ قال : مثل ذي القرنين وصاحب سليمان و صاحب موسى عليهم السلام » (ایضاًج ۱ ص ۲۶۸)

"میں نے ابو جعفر (امام باقر) علیہ السلام سے عرض کیا: علماء (ائمہ علیہم السلام) کا مقام کیا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ذوالقرنین، صاحبِ سلیمان (آصف بن برخیا) اور صاحبِ موسیٰ (خضر) علیہم السلام کی طرح۔"

اور چھٹی حدیث سدیر سے مروی ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں اور اس میں ہے:

« نحن خزان علم الله، نحن تراجمة أمر الله، نحن قوم معصومون، أمر الله تبارك وتعالى بطاعتنا ونهى عن معصيتنا، نحن الحجة البالغة على من دون السماء وفوق الأرض » (ایضاًج ۱ ص ۲۷۰)

"ہم اللہ کے علم کے خزینہ دار ہیں، ہم اللہ کے امر کے ترجمان ہیں، ہم ایک ایسی قوم ہیں جو معصوم ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری اطاعت کا حکم دیا ہے اور ہماری نافرمانی سے منع فرمایا ہے، ہم آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر (مخلوق پر) اللہ کی حجتِ بالغہ ہیں۔"

پھر اس کے بعد والے باب میں، جو کہ

"ائمہ علیہم السلام میں موجود ارواح کے ذکر کا باب"

ہے، وہ جابر جعفی کی امام ابو جعفر علیہ السلام سے مروی روایت کو پہلی حدیث قرار دیتے ہیں جس میں ہے:

«وأيدهم بروح الشهوة فيه اشتهوا طاعة الله عز وجل وكرهوا معصيته»

"اور اللہ نے روحِ شہوت کے ذریعے ان کی تائید فرمائی جس کی وجہ سے انہوں نے اللہ عزوجل کی اطاعت کی خواہش کی اور اس کی معصیت کو ناپسند کیا" (المصدر نفسہ ج ۱ ص ۲۷۲)۔

اسی طرح اگر آپ ان کی کتاب الکافی کے دیباچے، ابواب اور احادیث کا مطالعہ کریں تو آپ اسے عصمت اور اس پر ان کے عقیدے پر دلالت کرنے والی باتوں سے لبریز پائیں گے۔

اور عبد اللہ بن ابی یعفور رحمۃ اللہ علیہ اس عقیدے میں کلینی سے مختلف نہیں ہیں، پس اوصیاء کے بارے میں محض ان کا یہ تعبیر کرنا کہ وہ "علماء، نیکوکار اور متقی" ہیں، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ ان کی عصمت کی نفی کرتے ہیں یا انہیں دیگر انسانوں کی طرح سمجھتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ نیک عالم ہیں، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ خود یہ روایت کرتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید یافتہ اور فرشتوں سے کلام کرنے والے (محدث) ہیں؟ چنانچہ صفار نے اپنی سند کے ساتھ ان سے روایت کی ہے کہ

انہوں نے کہا: میں نے امام ابو عبد اللہ علیہ السلام سے عرض کی: کیا علی علیہ السلام کے قلب میں الہام کیا جاتا تھا یا ان کے سینے اور کان میں بات ڈالی جاتی تھی؟

آپ علیہ السلام نے فرمایا: علی علیہ السلام "محدث" (فرشتوں سے کلام کرنے والے) تھے۔

راوی کہتے ہیں: جب میں نے آپ علیہ السلام سے اس بارے میں زیادہ اصرار کیا تو

آپ علیہ السلام نے فرمایا: علی علیہ السلام بنی قریظہ اور بنی نضیر کے دن (ایسے تھے کہ) جبرائیل ان کے دائیں جانب اور میکائیل ان کے بائیں جانب تھے جو ان سے کلام کر رہے تھے

(بصائر الدرجات ج ۲ ص ۳۴۱)۔

اور یہ بات عصمت کے ساتھ ہم آہنگ ہے جیسا کہ معلوم ہے۔

اور ان کی ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو اس بات کو بے نقاب کرتی ہیں کہ وہ امام کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھتے تھے جو محض ایک نیک و متقی عالم ہونے کے عقیدے سے کہیں بڑھ کر ہے، لہذا ضروری ہے کہ ان کی "عالم" کی تعبیر کو اس طرح نہ سمجھا جائے جس میں عصمت، علم لدنی اور غیب پر اطلاع وغیرہ جیسے عقائد کی نفی شامل ہو۔ ان احادیث میں سے ایک وہ ہے جسے کشی نے ان سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ

میں نے امام ابو عبد اللہ علیہ السلام سے عرض کی: اللہ کی قسم! اگر آپ ایک انار کے دو ٹکڑے کر دیں اور فرمائیں کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال، تو میں گواہی دوں گا کہ جسے آپ علیہ السلام نے حلال کہا وہ حلال ہے اور جسے آپ علیہ السلام نے حرام کہا وہ حرام ہے۔

تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تم پر رحم کرے، اللہ تم پر رحم کرے

(رجال الكشي ص ۳۲۳)۔

یہ حدیث عصمت کے ایک بلند مرتبے پر یقین کے ساتھ ہم آہنگ ہے؛ نہ صرف حکم میں بلکہ موضوع میں بھی۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی یعفور کا اوصیاء کو "علماء" قرار دینا درحقیقت ان کی عصمت کے معنی کو شامل ہے، کیونکہ یہی وہ وصف تھا جو ائمہ علیہم السلام اور ان کے شیعوں کی زبان پر جاری رہتا تھا، اور اس کے ساتھ

ساتھ یہ وصف ضمنی طور پر دیگر تمام انسانوں پر ان کی برتری کے تمام معانی کا متقاضی تھا، جیسے کہ ان کا صاحبِ عصمت ہونا، علم لدنی، الہامِ الٰہی، فرشتوں سے ہم کلامی، اور غیب وضمائر پر اطلاع وغیرہ۔ یہی وہ بات ہے جو شیعوں کے ذہنوں میں راسخ تھی اس تعلیم کے نتیجے میں جو انہوں نے اپنے ائمہ علیہم السلام سے حاصل کی تھی، اور اس پر دلالت کرنے والی روایات کثیر ہیں، مثال کے طور پر امام ابوالحسن کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

«الأئمة علماء، صادقون، مفهمون، محدثون»

"ائمہ علماء ہیں، سچے ہیں، (اللہ کی طرف سے) فہم دیے گئے ہیں اور فرشتوں سے ہم کلام ہونے والے ہیں"

(بصائر الدرجات ج۱ ص۳۳۹)۔

آثار ہمیں بتاتے ہیں کہ بعض اصحاب نے جب ائمہ علیہم السلام سے یہ سنا کہ فرشتے ان سے کلام کرتے ہیں، تو وہ ان کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان فرق کو نہ سمجھ سکے، اور انہوں نے نبی اور محدث کے درمیان تمیز نہیں کی، جس کے نتیجے میں وہ اس قول کے ساتھ غلو میں مبتلا ہو گئے کہ ائمہ علیہم السلام نبی ہیں، جیسا کہ ابوالخطاب لعنہ اللہ۔ پس ابو جعفر علیہ السلام سے روایت ہے:

«هي التي هلك فيها أبو الخطاب فلم يدر ما تأويل المحدث والنبي» (**الکافی ج۱ ص۲۷۰**)،

یعنی یہی وہ بات تھی جس میں ابوالخطاب ہلاک ہوا کہ وہ محدث اور نبی کی تاویل کو نہ سمجھ سکا۔

تاہم دوسروں نے اپنے ائمہ علیہم السلام کی طرف رجوع کر کے خود کو ہلاکت سے بچا لیا تاکہ وہ ان کے لیے ان اشکالات کی تفسیر کریں جو ان پر گراں گزرے تھے، جیسے

حمران رضی اللہ عنہ، جو ابو جعفر علیہ السلام کے پاس یہ کہتے ہوئے آئے: کیا آپ علیہ السلام نے مجھ سے بیان نہیں فرمایا تھا کہ علی علیہ السلام محدث تھے؟

آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں۔

میں نے عرض کیا: ان سے کون کلام کرتا تھا؟

فرمایا: ایک فرشتہ ان سے کلام کرتا تھا۔

(حمران کہتے ہیں) میں نے عرض کیا: کیا میں یہ کہوں کہ وہ نبی یا رسول ہیں؟

آپ نے فرمایا: نہیں؛ بلکہ یوں کہو: ان کی مثال سلیمان علیہ السلام کے ساتھی (آصف بن برخیا) اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی خضر علیہ السلام جیسی ہے، اور ان کی مثال ذوالقرنین جیسی ہے

(بصائر الدرجات ج۱ ص۳۴۳)۔

اسی آخری حدیث کی دلالت سے معلوم ہوتا ہے کہ معلی بن خنیس بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کا قدم لمحہ بھر کے لیے پھسل گیا تھا اور انہوں نے ابوالخطاب والا قول اختیار کر لیا تھا کیونکہ وہ محدث اور نبی کی تاویل سے واقف نہ تھے، چنانچہ ان کے اور ابن ابی یعفور کے درمیان اس معاملے میں جدل واقع ہوا۔ جہاں ابن خنیس فرشتوں کے ہم کلام ہونے کی وجہ سے یہ کہہ رہے تھے کہ اوصیاء انبیاء ہیں؛ وہیں ابن ابی یعفور کا کہنا تھا کہ وہ علماء، ابرار اور اتقیاء ہیں، یعنی معصوم، من جانب اللہ تائید یافتہ، محدث اور مفہم ہونے کے باوجود ان پر نبوت کے وصف کا اطلاق جائز نہیں ہے، اور ہم انہیں تشبیہ نہیں دیتے مگر جنابِ سلیمان علیہ السلام کے اس ساتھی سے جسے قرآن نے صاحبِ علم قرار دیتے ہوئے فرمایا: «قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ»، یا جنابِ موسیٰ علیہ السلام کے اس ساتھی سے جسے قرآن نے صاحبِ علم قرار دیتے ہوئے فرمایا: «وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا»، یا

جنابِ ذوالقرنین علیہ السلام سے جنہیں قرآن نے اللہ سبحانہ کی طرف سے محدث اور معلم قرار دیتے ہوئے فرمایا: «قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ»۔

یہ وہ بحث تھی جو ان دو شخصیات کے درمیان ہوئی، اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ عصمت میں شک یا اس پر بحث سے مکمل طور پر دور ہے۔ یہ بحث صرف اس بارے میں تھی کہ اوصیاء علیہم السلام پر نبوت کی صفت کا اطلاق جائز ہے یا نہیں، اور امام صادق علیہ السلام نے ابتداءً ہی ابن ابی یعفور سے یہ فرما کر معاملے کو ختم کر دیا: جو کہے کہ ہم علیہم السلام انبیاء ہیں اس سے برأت کا اظہار کرو۔ یہ بذاتِ خود امام صادق علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا کہ انہوں نے ان دونوں کے کلام کرنے سے پہلے ہی جان لیا کہ ان کے درمیان کیا بحث چل رہی ہے، اور اسی کے اثر سے ابن خنیس نے اپنی لغزش سے رجوع کر لیا۔

کج فطرت لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ ابن ابی یعفور کا ائمہ علیہم السلام کو علماء، ابرار اور اتقیاء کہنا ان کی عصمت کے عقیدے کی نفی کرتا ہے! ان کا یہ وہم محض ان کی علمی کم مائیگی اور ان اخبار و آثار سے لاعلمی کی وجہ سے ہے جن میں سے کچھ ہم نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں، جہاں اس فکری معرکے کی نوعیت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے جس نے فریقین کے درمیان اس جدل کو جنم دیا، اور یہ کہ یہ بحث صرف اس مسئلے پر نظر رکھتی تھی کہ ائمہ علیہم السلام محدث ہیں اور اس بنیاد پر ان کی صفت کے بارے میں کیا عقیدہ ہونا چاہیے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن خنیس کہہ رہے تھے: جب یہ ثابت ہے کہ وہ فرشتوں کے محدث ہیں تو وہ انبیاء ہیں! تو ابن ابی یعفور نے انہیں جواب دیا: ہاں وہ محدث ہیں مگر میں ان کے وصف میں اس حد سے آگے نہیں بڑھوں گا جو انہوں نے خود اپنے لیے بیان فرمائی ہے، لہذا میں کہوں گا کہ وہ علماء ہیں۔ اور اللہ عزوجل کے قول: «بَلْ هُوَ آيَاتٌ

بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ » کے بارے میں امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: اس سے مراد ائمہ علیہم السلام ہیں (الکافی ج ۱ ص ۲۱۴)۔

سوال 4

شیخ مامقانی نے کتاب تنقیح المقال میں کہا ہے:"بل أكثر ما نعتقده الآن في أهل البيت عليهم السلام كانوا يومئذ يسمونه غلوا" (بلکہ آج ہم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں جن باتوں کا اعتقاد رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر کو وہ لوگ اس زمانے میں غلو کا نام دیتے تھے)۔ تو اس عبارت کی آپ کے نزدیک کیا تفسیر ہے؟ اور کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عقائد ـــ بشمول عصمت ـــ ارتقاء پذیر ہو سکتے ہیں اور کچھ چیزیں جو پہلے ضروری نہیں تھیں وہ ضروری بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس بھی ممکن ہے؟! جیسا کہ شیخ حبیب نے اپنے ایک لکچر میں قمیین کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ لوگ نبی کے سہو کا انکار کرنے والے کو غالی سمجھتے تھے اور وہ عقیدے میں کمزور تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم قمیین کے تشیع سے خارج ہونے کا حکم کیوں نہیں لگاتے؟ کیونکہ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سہو کا قائل ہو وہ عصمت کا منکر ہے اور جو عصمت کا منکر ہو وہ شیعہ نہیں رہتا؟

جواب: دینی ضرورت (ضرورتِ دینیہ) حقیقت اور واقع کی دنیا میں تبدیل نہیں ہوتی، البتہ اس کا منکشف ہونا یا اسے دریافت کرنا انسانی ادراک پر موقوف ہے، اور انسانی ادراک کبھی صحیح نتیجے تک پہنچتا ہے اور کبھی خطا کر جاتا ہے۔ پس کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو متقدمین کے نزدیک بالکل واضح اور ظاہر تھیں لیکن ہمارے زمانے میں وقت گزرنے اور دلائل کے ضائع ہونے کی وجہ سے ان میں ابہام پیدا ہو گیا، اور کتنی ہی ایسی چیزیں جو اس

زمانے میں پوشیدہ تھیں لیکن صدرِ اول میں بکھرے ہوئے دلائل کے جمع ہونے یامتاخرین کے دور میں اس پر دوبارہ اجماع ہو جانے کی وجہ سے وضاحت اور جلا کا لبادہ اوڑھ چکیں، جیسا کہ سید بحر العلوم نے فرمایا ہے۔

اور علامہ مامقانی رحمہ اللہ کی کلام صرف اس مقام پر تھی جہاں وہ بعض متقدمین (جیسے قمیین) کی جانب سے بعض راویوں پر غلو کے دعویٰ کی بنیاد پر کی جانے والی جرح پر بلا سوچے سمجھے اعتماد کرنے سے ڈرا رہے تھے، کیونکہ انہوں نے واضح کیا کہ وہ لوگ کسی شخص کی طرف غلو کی نسبت دینے میں افراط سے کام لیتے تھے جیسے ہی وہ اس سے ایسی کوئی روایت سنتے جسے وہ ہضم نہ کر پاتے۔ اور ان کا یہ قول کہ:

«إن الغلو عند القدماء ينسب إلى الرجل بأدنى شيء، بل أكثر ما نعتقده الآن في أهل البيت عليهم السلام كانوا يومئذ يسمونه غلوا»

"متقدمین کے نزدیک غلو کی نسبت کسی بھی شخص کی طرف معمولی سی بات پر دے دی جاتی تھی، بلکہ آج ہم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں جن باتوں کا اعتقاد رکھتے ہیں ان میں سے اکثر کو وہ اس وقت غلو کا نام دیتے تھے"۔

(تنقیح المقال ج6 ص340)۔

یہ قول ان کے اس بیان پر معطوف ہے کہ:

«إنه لا يخفى على من تتبع أحوال القدماء - سيما القميين منهم أنهم كانوا يجرحون الرجل بأدنى شيء، وينسبون إليه الانحراف في فروع أصول الدين بمجرد رؤية رواية في كتابه دالة عليه، أو نسبه واحد ذلك إليه، فيلزم المجتهد في الرجال أن يبذل جهده في تحقيق ذلك، وأنه إذا ثبتت عنده وثاقة الرجل، وكونه إماميا بشهادة أهل الخبرة بذلك - كالنجاشي والشيخ والعلامة وأضرابهم - لا يقبل في حق الرجل تهمة في ما يرجع إلى فروع أصول المذهب أو الدين (...) ولا ينبغي قبول كل

جرح من كل أحد، فإن جرحهم ليس كالتعديل، فإن مقتضى الاشتباه في التعديل يسير، بل من أمعن النظر في كلماتهم ودقق الفكرة في سيرتهم علم أنهم لا يوثقون الرجل إلا إذا كان في أعلى درجات العدالة، ولكنهم في الجرح يجتزئون بأدنى جرح من أحد، مع أن مقتضيات الاشتباه في الجرح كثيرة، فإن جملة كثيرة مما نعتقده في حق النبي صلى الله عليه و آله وسلم والأئمة عليهم السلام اليوم كان يُرمى المعتقد به في سالف الزمان بالارتفاع و الغلو، وكثيرا ما يجرحون الراوي بأدنى سبب، وكانوا يخرجون الراوي من قم لأشياء لا تورث فسقا قطعا - كتمويه الأمر على حماره بأن في ذيل ثوبه شعيرا أو علفا .. ونحو ذلك - فينبغي التدقيق في أمر الجرح مثل العدالة، بل أكثر ، لما ذكرنا من كثرة مقتضيات الاشتباه في الجرح، حتى أنه قد وقع نزاع كثير بين الشيعة أنفسهم في بعض فروع الأصول على وجه أدى إلى المنافرة بينهم»

"جو شخص متقدمین خصوصاً قمیین کے حالات کا تتبع کرے اس پر یہ چھپا ہوا نہیں ہے کہ وہ معمولی سی بات پر کسی شخص پر جرح کر دیتے تھے، اور محض اس کی کتاب میں کسی روایت کے پائے جانے یا کسی ایک شخص کی طرف سے نسبت دیے جانے پر اس کی طرف اصولِ دین کی فروع میں انحراف کی نسبت دے دیتے تھے، لہٰذا علمِ رجال کے مجتہد پر لازم ہے کہ وہ اس کی تحقیق میں اپنی پوری کوشش صرف کرے، اور جب اس کے نزدیک ماہرینِ فن جیسے نجاشی، شیخ اور علامہ وغیرہ کی گواہی سے کسی شخص کی وثاقت اور اس کا امامی ہونا ثابت ہو جائے تو پھر مذہب یا دین کے اصول کی فروع کے متعلق اس کے حق میں کسی تہمت کو قبول نہ کرے۔۔۔ اور ہر کسی کی طرف سے ہر جرح کو قبول کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ ان کی جرح تعدیل کی طرح نہیں ہے، تعدیل میں اشتباہ کی گنجائش کم ہوتی ہے بلکہ جو ان کے کلمات پر غور کرے اور ان کی سیرت کو باریک بینی سے دیکھے اسے معلوم ہو گا کہ وہ کسی شخص کی اس وقت تک توثیق نہیں کرتے جب تک وہ عدالت کے اعلیٰ درجے پر نہ ہو، لیکن جرح میں وہ کسی کی طرف سے معمولی جرح پر بھی اکتفا کر لیتے ہیں، حالانکہ جرح میں اشتباہ کے

اسباب بہت زیادہ ہیں۔ کیونکہ بہت سی وہ باتیں جن کا اعتقاد آج ہم نبی ﷺ اور ائمہ علیہم السلام کے حق میں رکھتے ہیں، گزشتہ زمانے میں ان کا اعتقاد رکھنے والے پر بلندی اور غلو کی تہمت لگائی جاتی تھی، اور وہ اکثر راوی پر معمولی سبب کی بنا پر جرح کر دیتے تھے، اور وہ راوی کو ایسی چیزوں کی وجہ سے قم سے نکال دیتے تھے جو قطعاً فسق کا باعث نہیں ہوتیں — جیسے اپنے گدھے کو دھوکا دینا کہ اس کے دامن میں جو یا چارہ ہے — پس جرح کے معاملے میں عدالت کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تدقیق ہونی چاہیے، اس لیے کہ جرح میں اشتباہ کے اسباب بہت زیادہ ہیں، یہاں تک کہ خود شیعوں کے درمیان اصول کی بعض فروع میں اس قدر نزاع واقع ہوا جس نے باہمی نفرت تک پہنچا دیا"

(ایضاً ج2 ص354)۔

اور اس سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ ان (مامقانی) کی کلام کا اصل میں متقدمین کے نزدیک عصمت کے عقیدے کی ضرورت کی بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ — بشمول قمیین — اس کے معتقد تھے۔ زیادہ سے زیادہ بات یہ ہے کہ وہ بعض راویوں پر جرح کرنے میں اس لیے افراط کرتے تھے کیونکہ وہ ایسی روایات بیان کرتے تھے جنہیں وہ — معاملے کے مخفی ہونے یا ادراک نہ کر پانے کی وجہ سے — غلو اور حد سے تجاوز سمجھتے تھے۔ اور ہم آج دلائل کے جمع ہونے اور ادراک کے دائرہ کار کے وسیع ہونے کے بعد اسے کوئی ایسی چیز نہیں پاتے جو قدح (عیب) کا باعث ہو، بلکہ ہم نے اسے اپنے مذہب کی ضروریات کے موافق پایا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں جنہیں آج ہم دلائل کے ضائع ہونے کی وجہ سے ضروری نہیں سمجھتے لیکن وہ ان کے نزدیک دلائل کے زمانے سے قریب ہونے کی وجہ سے ضروریات میں سے تھیں۔

معاملہ کچھ بھی ہو؛ علامہ مامقانی کی کلام متقدمین کے ایک گروہ یعنی قمیین کے ساتھ خاص ہے، تمام متقدمین جیسے بغدادیوں کے لیے نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ موقف اختیار کرنا ممکن ہے کہ عصمت کا اعتقاد شیعوں کے تمام ادوار میں ہمیشہ سے ضروری رہا ہے، ائمہ علیہم السلام کے حضور کے زمانے سے لے کر آج تک، قدیم و جدید دونوں دور میں۔ کیونکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ شیعوں کا کوئی ایک گروہ بعض ایسے فکری یا ماحولیاتی و ثقافتی عوامل کی وجہ سے اس کا معتقد نہ رہا ہو جو ان پر طاری ہوئے اور انہیں اس قصور یا تقصیر میں مبتلا کر دیا۔ یہ تو اس صورت میں ہے اگر ہم بحث کی خاطر یہ تسلیم کر لیں کہ قمیین عصمت کے معتقد نہیں تھے، جبکہ حقیقت میں وہ اس کے معتقد تھے۔ رہا ان میں سے بعض کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام سے سہو کے وقوع کا قول، تو یہ ان کے اصلِ عصمت کے عقیدے کو نقصان نہیں پہنچاتا، کیونکہ ان کے اقوال میں باریک بینی سے غور کرنے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے ان روایات کو لیا ہے جن میں "اِسہاء" (اللہ کی طرف سے بھلا دیا جانا) کا ذکر ہے نہ کہ "سہو" (خود سے بھول جانا) کا۔ اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھلا دیا تاکہ وہ جان لیں کہ سہو پر کیا احکام مرتب ہوتے ہیں۔ اور یہ قول—علمی طور پر—اپنے قائل کے نزدیک عصمت کے عقیدے کے منافی نہیں ہے کیونکہ "اِسہاء" دراصل حقیقت کے بدل جانے سے عبارت ہے جس کے ساتھ تکلیف (حکم) بھی بدل جاتی ہے۔ اور ہم اگرچہ ان روایات کو لینے میں انہیں خطاکار سمجھتے ہیں کیونکہ وہ روایات عامہ (اہل سنت) کے موافق ہیں؛ لیکن ہم یہ حق نہیں رکھتے کہ ان پر سختی کریں اور ان پر ایسا لازمہ تھوپ دیں جس کے وہ قائل نہیں ہیں اور ان پر عصمت کے انکار کی تہمت لگائیں جبکہ وہ اس کے قائل ہیں۔ آپ اس سلسلے میں سن 1434 ہجری کے رمضان المبارک کے ہمارے بعض لیکچرز اور علمِ کلام کے دروس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جہاں ہم نے اس مسئلے کی تفصیل بیان کی ہے۔

سوال نمبر 5

میرے ذہن میں ہمیشہ یہ سوال ابھرتا ہے کہ جو شخص نبی کے سہو کا قائل ہو یا جو یہ اقرار کرے کہ "عبس وتولی" نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں نازل ہوئی، ہم اس پر مذہب سے خارج ہونے کا حکم کیوں نہیں لگاتے؟ جیسا کہ میں نے سنا ہے کہ ہمارے مفسرین اور علماء میں سے بعض ایسے ہیں جو اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نازل ہونے کے قائل ہیں، تو ہم ان مفسرین کے مذہب سے خارج ہونے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ اور ان تمام لوگوں کے خارج از مذہب ہونے کا حکم کیوں نہیں دیتے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سہو کے قائل ہیں جیسے کہ قمیین؟ حالانکہ ان لوگوں نے دین کی ضروریات میں سے ایک ضرورت یعنی عصمت کی مخالفت کی ہے؟ اور میرے ناقص علم کے مطابق بہت سے علماء یہ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا فعل "ترکِ اولیٰ" تھا! تو ہم ان تمام لوگوں پر جو انبیاء یا ائمہ علیہم السلام کے لیے ترکِ اولیٰ کو جائز قرار دیتے ہیں، دین سے خارج ہونے کا حکم کیوں نہیں لگاتے؟ کیا ترکِ اولیٰ عصمت کے منافی نہیں ہے؟

جواب: اگر ہمارے نزدیک ان فاسد مقالات کا قائل اس بات کا پابند نہ ہو کہ یہ چیزیں عصمت کو ٹھیس پہنچاتی ہیں؛ چاہے یہ (بات اس پر) پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہو یا کسی شبہ یا ادراک کی کمزوری یا قصور کی وجہ سے، تو ہمارے لیے اسے مذہب سے خارج کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ اصل (عصمت) کا تو پابند ہے لیکن اس کی ایک تفصیل کا منکر ہے۔ یعنی وہ عصمت کا التزام کرتا ہے اور مثلاً یہ کہتا ہے کہ "ترکِ اولیٰ" اس (عصمت) کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، اور اسی طرح "اسہاء" (اللہ کی طرف سے بھلا دیا جانا) بھی نقصان دہ نہیں ہے۔ ہاں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ معاملہ اتنا واضح ہو چکا ہو جس سے قائل پر حجت تمام ہو جائے، تو اس وقت ہمارے لیے اس کے مذہب سے خارج ہونے کا حکم لگانا ممکن ہے۔ بہر حال، یہ واضح کرنے کے بعد کہ یہ امور حقیقت میں عصمت کو ٹھیس پہنچاتے ہیں، ہمارے لیے اس (قائل) پر سخت نکیر (تنقید) کرنا لازم ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَأَهْلِ بَيْتِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى قَتَلَتِهِمْ وَأَعْدَائِهِمْ أَجْمَعِيْنَ۔